# نہج البلاغہ

## دستورِ حیات و اقدارِ بشریت کا سرچشمہ

پروفیسر سید اطہر رضا بلگرامی

انسانی فکر و کاوش ازل سے ایک ایسے نظامِ حیات کی تلاش میں سرگرداں ہے جو انسانیت کے فروغ اور اجتماعی زندگی کے لئے صالح، متوازن اور موزوں ہو۔ انسان ایسے نظام کی جستجو میں اس وقت بھی تھا جب معاشرہ چند نفوس کی آبادی تک محدود تھا اور زندگی چند عوامل پر بسر ہو رہی تھی اور عصرِ حاضر کے باہوش، باخبر و باعمل تیز رو ترقی یافتہ انسان کو بھی ہے جو آج تسخیرِ کائنات کا حوصلہ رکھتا ہے اور پُر اعتمادی سے اپنے رب سے سوال کرتا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
غالب

لیکن ایسا پُر اعتماد انسان جو تسخیرِ کائنات کا حوصلہ رکھے اور "دشتِ امکاں" کو "ایک نقشِ پا" سمجھے کتنا مجبور و بے بس ہے کہ ایک پُر امن و پُر وقار نظامِ حیات کو تشکیل دینے سے آج تک قاصر ہے۔ اس نے سابق تجربات کی روشنی میں جہدِ پیہم اور مسلسل ردّ و بدل کے عمل سے ایک غیر مستحکم و غیر یقینی سی طرزِ زندگی تو حاصل کر لی لیکن نہ کوئی مستحکم دستورِ حیات مرتب کر سکا اور نتیجتاً نہ اقدارِ حیات کو فروغ دے سکا اور نہ ہی ان کا تحفظ کر سکا۔ اس کی تمام تر ترقی تنزلی، کا پیش خیمہ بنی رہی۔ حضرت علیؑ کا کلام نہج البلاغہ کی شکل میں آج دنیا کے سامنے بھٹکی ہوئی انسانی فکر اور شکست خوردگیوں و محرومیوں میں گھری انسانیت کی آخری پناہ گاہ ہے جہاں خطبات، خطوط، وصیتیں، نصیحتیں حکم و مواعظ اور اقوال انسان کے ذہنی انتشار کو سکون بخشتے ہیں اور تنبیہ، ہدایت و انتباہ کے حصار میں صراطِ مستقیم کی رہنمائی کرتے ہیں۔

میں نہ اس کی جرأت کرسکتا ہوں اور نہ اس کا اہل ہوں کہ ایسے گراں پایہ صحیفہ کی جزئیات کو اپنے موضوع کی تشریح کا ذریعہ بنا کر یہ دعویٰ کروں کہ میں نے ان میں پوشیدہ معنی و مطالب کے خزانوں کو واضح کردیا ہے۔ میری کوتاہ عقل و فہم نے جس حد تک میرا ساتھ دیا میں اسی محدود دائرے میں جزئیات میں بیان کردہ دستور حیات و اقدار بشریت کی نشان دہی کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ مضمون دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں دنیا کے مروّجہ نظام حیات و اقدار بشریت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں اسلام و نہج البلاغہ کی روشنی میں حیات انسانی کے دستور و اقدار کی تشریح کی گئی ہے۔

میں گفتگو کا آغاز انسان کی تعریف سے کر رہا ہوں۔ اس حقیقت کو مسلمہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان جزوِ کائنات ہے اور مادہ یعنی جسم و روح کا مرکب ہے۔ جزوِ کائنات ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب کچھ انسان میں بھی ہے بلکہ شریکِ کائنات ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کے اجزاء و عناصر کے آپسی ربط و ضبط میں جو تناسب و توازن پایا جاتا ہے وہی نظم و ضبط اور توازن انسان کے اجزاء و عناصر میں ملتا ہے۔ انسان کائنات کا جز ہے تو کائنات کی ہر خصوصیت اس میں سموئی ہوئی ہے۔ تا ابد انسان اپنی عقل و فہم کے مطابق جو بھی انکشافات کرتا رہے گا، خواہ وہ انکشافات کسی میدان کے ہوں، کائنات کے عناصر سے ہٹ کر نہیں کرسکتا۔

انسان مادہ یعنی جسم اور روح کا مرکب ہے۔ اس لئے دونوں کی توانائی و حیات کے لئے مادی و روحانی وسائل چاہئے جن کے بغیر ان کا فعال بنا رہنا ممکن نہیں۔ اگر انسانی جسم اور اس کے اعضاء و جوارح کا تقاضہ ہے کہ اچھی غذا، صحت مند ماحول، پانی، رہائش، موسم کے اعتبار سے آرام دہ کپڑے وغیرہ جیسے مادی وسائل دستیاب رہیں تو روح کی تازگی، بالیدگی و صحتمندی کا تقاضہ ہے کہ انسان بلند کردار و اخلاق، منصفانہ فکر و عمل، جائز و ناجائز کی تمیز، صبر و قناعت جیسے جوہروں سے مزین رہے۔ انسان میں یہ مادی و روحانی دونوں عناصر لازم و ملزوم ہیں۔ جسم کا تصور بغیر روح کے ممکن نہیں اور روح کے فعال ہونے کے لئے ایک جسم چاہئے۔ ان دونوں کے متوازن رہنے میں ہی حیاتِ انسانی کو بلند درجات عطا ہوتے ہیں۔ مزید، انسان کے روحانی جوہر وہ ہیں جو اس کے مادی تقاضوں کی پاسبانی کرتے ہیں۔ جب کبھی انسان نے نفسانی و مادی ضرورتوں کی حدوں کو پار کیا تو احساس گناہ، ضمیر کی ملامت، شرمندگی، پچھتاوا، صدمہ، افسوس جیسے جذبات و احساسات نے اس کو راہِ راست کی

طرف پلٹا دیا۔ جب تک انسان کی نفسانی و مادی خواہشات روح کی اس نگہبانی کو قبول کرتی رہتی ہیں جسم و روح کا توازن باقی رہتا ہے یہی توازن صحت مند انسانی معاشرہ کا ضامن ہوتا ہے جہاں تمام بشریت کی اعلیٰ قدریں فروغ پاتی رہتی ہیں۔ لیکن جب انسان کی نفسانی و مادی خواہشات کی سرکشی روح پر حاوی ہوکر اس کو اتنا آلودہ کردے کہ انسان نہ اپنے ضمیر کی آواز سنے، نہ اس کو شرمندگی و پچھتاوے کا احساس ہو، نہ اس میں احساس گناہ باقی رہے، نہ کوئی جذبۂ رحم و انصاف ابھرے تو روح کی یہی مُردنی معاشرے کے عدم توازن اور اقدارِ بشریت کی پامالی کا سبب بن جاتی ہے۔

اسلام ایک دینِ فطرت ہونے کی وجہ سے انسان کے مادی و روحانی تقاضوں کو فطری تسلیم کرتا ہے اور صحت مند انسانی معاشرے کی تشکیل و اقدارِ بشریت کے فروغ کے لئے ان دونوں کے توازن پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے، اس کی نگاہ میں صحت مند جسم کے لئے مادی وسائل کی دستیابی و تصرف نہ صرف ناگزیر بلکہ فطری ہے جس کو پورا کرنا مذہبی فریضہ کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن اسلام ان کو آزاد نہیں چھوڑتا بلکہ روح کی مکمل سرکردگی اور پاسبانی میں رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ انسان کے مادی وجود کی دو خصوصیات جن کو ہم کمزوریاں کہہ سکتے ہیں ایسی فطری مستحکم و بنیادیں ہیں جن کو نہ دبایا جاسکتا ہے اور نہ فنا کیا جاسکتا ہے۔ ہاں تعلیم و تربیت و ترغیب کے ذریعہ رام کیا جاسکتا ہے۔ ان کو اگر روح کی نگہداشت و سرپرستی سے آزاد کردیا جائے تو اقدارِ بشریت یقیناً پامال ہوں گے اور انسانی معاشرہ امن و سکون سے محروم رہے گا۔ روح کی پاسبانی ان میں نظم و ضبط و اعتدال و شائستگی قایم رکھتی ہے۔

اوّل، انسان لامتناہی خواہشات و تمناؤں کا پلندہ ہے جس کا سلسلہ پہلی سے آخری سانس تک کسی لمحے ختم نہیں ہوتا۔ ان میں ایسی شدت پائی جاتی ہے کہ بقول غالبؔ ہر خواہش پہ دم نکلتا ہے اور بہت کچھ حاصل ہونے پر بھی یہی احساس رہتا ہے کہ ابھی ارمان کم نکلے ہیں۔ نتیجتاً وہ طمع، حرص، حسد، نفرت، توہم پرستی اور ہوس جیسے رُجحانات کا شکار بنتا ہے۔ دوم، انسان خودغرض بھی ہے۔ اس کے ''حبِ نفس'' کا جذبہ اپنی ذات کی تسکین میں ہی محصور رکھتا ہے اور نتیجہ میں ذخیرہ اندوزی، جمع خوری، منافع خوری، شقاوت، بے رحمی، بے حسی، جیسے رجحانات کی طرف مائل ہوتا ہے اور غیر منصفانہ نظام تقسیم میں ہی سکون کا احساس کرتا ہے۔

اس پس منظر میں اگر دنیا کے مروجہ نظام حیات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہی

نظام انسان میں پائی جانے والی انہیں دو کمزوریوں پر ٹکے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظامِ حیات انسان کی لامتناہی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ ہوا دیتا نظر آتا ہے کیونکہ ان کے مسلسل پھیلاؤ میں اس کو اپنے نظام کا استحکام قوی تر ہوتا نظر آتا ہے ۔ انسان کی خودغرضیوں کو بھی اس نظام میں خوب توانائی ملتی ہے۔ انسان کے جذبۂ آزادی کو بے لگام بنایا گیا تاکہ وہ حسب استعداد دولت و ثروت سمیٹتا رہے انسانوں کے جسمانی، ذہنی، نفسانی، طبعی، معاشرتی تفریق سے منھ موڑ کر، ان کو پس پشت ڈال کر معاشرے کو عدم مساوات و استحصال کے کبھی نہ ٹوٹنے والے حصار میں جکڑتے رہنے کے لئے چھوڑ دے۔ ایسے نظام میں دولت مند و بااقتدار افراد کے اندر بے رحمی، شقاوت، بے حسی، رعونت جیسے جذبات کا ابھرنا فطری ہے کیونکہ یہی اس کی خودغرضیوں کے محافظ بنتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اخلاقی پستیوں کی شکل میں سامنے ہے۔

ایسے معاشرے میں پرورش پانے والا انسان اپنے سے کم تر طبقہ کو حقیر و ذلیل اور اپنے کو صاحب عزت و احترام سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں کو اپنے مدِ مقابل ہوتے دیکھ کر ان کو پیچھے ڈھکیلنے کا کوئی حربہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ بزرگ والدین کی خدمت واطاعت کو تضیع اوقات سمجھتا ہے کیونکہ وہ اب اس سسٹم کے کارآمد پرزے نہیں رہے جس پر وقت و سرمایہ کھپایا جائے۔ بچوں کی سرپرستی و نگہداشت کو بھی وقت کی بربادی گردانتا ہے اور اس کے لئے خصوصی ماہرین یا اداروں کا سہارا لے کر اس فرض کی ادائیگی سے مطمئن ہوجاتا ہے۔ ایسے ماحول کا پروردہ انسان ذہنی، معاشرتی و اخلاقی اعتبار سے اس قدر پستی کا شکار ہوجاتا ہے کہ لاچاری وغربت میں ساہوکار کے ذریعہ دیئے گئے ادھار روپیہ کو اعلیٰ انسانی خدمت قرار دیتا ہے۔ اس کی ناآسودہ زندگی خودداری کا گلا گھونٹ کر احسان مندی کے بوجھ تلے دبے رہنے کی خوگر ہوجاتی ہے۔ وہ ساہوکار کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ وہ برے وقت کام آیا اور وقت مقررہ پر رقم واپس کردینے پر اگر ساہوکار بطور ستائش سود کے چند روپیہ معاف کردے تو اس کے اس فعل کو عظیم کارِ خیر سمجھنے لگتا ہے۔ اس نظام میں اقدارِ انسانی کی پستی کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی سود کی رقم واپس نہ کرسکے تو وہ سماج کا سب سے بڑا مجرم لیکن ساہوکار سود کی رقم کھاکر غریب کا تاحیات استحصال کرتا رہے، صاحب اقتدار کمزوروں کی کاوشوں ومحنت کو ناقدری کی نگاہ سے دیکھتے رہیں، لاچار و بے بس انسانوں کو معاشرے کا ناکارہ پرزہ سمجھا جاتا رہے تو یہ کوئی جرم نہیں۔

اس نظامِ معاشرت کی عمارت، کامل آزادی، انفرادی ملکیت اور دولت و ثروت و سرمایہ کی سطح پر ٹکی

ہے۔ اس کی فکر یہ بتلاتی ہے کہ انسان فطری طور پر آزاد پیدا ہوا ہے تو پھر اجتماعی طور پر بھی آزاد رہنا چاہئے۔ حکومت کو اس آزادی میں نہ مداخلت کرنی چاہئے اور نہ اس راہ میں سدِّ راہ ہونے کا حق ہونا چاہئے۔ جب سماج میں ہر فرد کو حسب خواہش اور حسب استعداد کام کرنے کی آزادی ہوگی تو پورا سماج سرگرم عمل ملے گا اور اس طرح "انفرادی آزادی"، اجتماعی خوشحالی کا وسیلہ بن جائے گی۔ فرد کی آزادی اور اس کے انتخابِ روزگار میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ لیکن ایک اہم نکتہ کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا اور وہ یہ کہ انسان انفرادی طور پر تو یقیناً آزاد پیدا ہوا ہے لیکن اجتماعی طور پر نہیں۔ اجتماعی معاملات میں ہر شخص کو دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھنا پڑے گا تاکہ دوسرے کے حقوق کا تحفظ خود اس کے حقوق کے تحفظ کا ذریعہ بنے۔ اس طرح گویا ہر فرد پر دوسرے کی زندگی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ طرزِ فکر میں آزادی کا جو تصور ہے اس سے مادی نشاط و ذرائع پیداوار میں وسعت تو ممکن ہے لیکن اس کو عوام تک پہنچانے کی ضمانت نہیں ملتی۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشرے کے افراد، اعضاء و جوارح، جذبات و احساسات اور طبیعت و مزاج، ذہنی سطح کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوتے۔ ان میں چاق و چوبند، سست و کاہل، مہم جو و محتاط، ضعیف و لاغر، عقل مند و کند ذہن بھی ہوتے ہیں۔ نتیجتاً سب کی صلاحیتیں برابر نہیں ہو سکتیں۔ لیکن خواہشات و تمناؤں اور خود غرضی کا جذبہ ہر فرد میں موجود ہوتا ہے۔ بغیر اس تفریق کا لحاظ کیے آزادی مساوات کی پامالی کا سبب بنے گی۔ یہاں آزادی جس فطری نظام کے تحت فلاح و مساوات کا تصور پیش کر رہی ہے وہ دراصل ایک مخصوص زاویہ فکر کی تبلیغ کے آلہ کار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس نظام کے بینکنگ سسٹم، فرسودہ نظامِ سود سے ہٹ کر خالص فلاحی سسٹم میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جہاں استحصال کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن پھر بھی کیا یہ نظام ہماری مادّی خواہشات کو ہوا دیتا، ان کو ترغیب دیتا نہیں ملتا جہاں صاحب دولت و ثروت کو مزید دولت سمیٹنے کا بھرپور موقع ملتا ہے اور نسبتاً کم صاحب حیثیت کو کم اور پھر استحصال نہ بھی سہی تو کیا یہ سسٹم معاشرے میں معاشی خلیج کو مزید وسیع کرنے کا ذریعہ نہیں بنتا؟

جان لیوا مقابلے، حق تلفی، استحصال اور غیر عادلانہ رویہ کو جھیلتے جھیلتے جب معاشرہ شدید انتشار و بدامنی کا شکار ہوا تو شدید ردعمل کے بطور اشتراکی نظام کی آغوش میں پناہ ڈھونڈنے آیا جس کی بنیادیں مساوات پر قائم کی گئیں۔ اشتراکی نظام سرمایہ دارانہ نظام کا انتقامی عکس العمل تھا، اس کی ضد

تھا اور ظاہر ہے جو نظام انتقام وضد پر کھڑا ہو وہ معاشرے کو انقلابی و انتقامی فکر کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔ وہ استحصال، عدم مساوات اور عدم انصاف کے خلاف ہمیشہ تبرد آزما نظر آئے گا۔ اس نظام نے تمام عیوب کی جڑ انسان کی بے لگام آزادی کو قرار دیا جس نے انفرادی ملکیت کا تصور ابھارا اور جو تمام برائیوں کا باعث بن گئی۔ نتیجتاً شدتِ انتقام کا غلبہ دوسری مخالف انتہا کی طرف لے گیا جہاں اس نے انسان کی فطری آزادی کے جذبہ کو ہی سلب کرلیا اور ''انفرادی آزادی'' کو ''اجتماعی آزادی'' اور ''انفرادی ملکیت'' کو ''اجتماعی ملکیت'' میں بدل دیا۔ اس نظام نے ملک کی ساری دولت، سرمایہ و وسائل اور خدمات وعوام کو ملک کا خادم قرار دیا۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ بقدرِ استعداد، رجحان و صلاحیت، محنت کرے اور بقدر ضرورت اس کا ثمر حاصل کرے۔ اس کی ضرورتوں کا تعین وہ خود نہیں بلکہ اسٹیٹ کرے گا۔ اس طرح انسان کا اپنا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ پیدا ہوتا ہے تو جماعت کے لئے، محنت کرتا ہے تو جماعت کے لئے، کاوش اور جستجو میں سرکھپاتا ہے تو جماعت کے لئے جئے تو جماعت کے لئے اور مرے تو جماعت کے لئے۔ اس طرح گویا وہ پیدائش ہی سے حکومت کا غلام اور اپنے دست و بازو کی طاقت کو اسٹیٹ کا صدقہ سمجھے۔ اس نظام نے حبِ ذات اور ''حبِ نفس'' جیسے فطری جذبات کو ''حبِ جماعت'' میں ضم کرنے کی کوشش کی اور اس کے لئے تعلیم وتربیت وقہر وغلبہ کا راستہ اپنایا۔ اس کے ذریعہ یہ فکر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ انسان کا ذاتی وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا، وہ جو بھی ہے سماج کے جز کے بطور اہمیت کا حامل ہے۔

یہ جذبہ کہ تم سماج کے لئے ہو یقیناً قابلِ قدر ہے لیکن اس قیمت پر کہ تم کچھ بھی نہیں ہو غیر فطری ہے۔ طاقت و جبر سے ہر بات منوائی جاسکتی ہے لیکن انسان کے جذبۂ آزادی اور اس کے حبِ نفس کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ تعلیم وتربیت کے ذریعہ اس میں سلیقہ، وسعت، ٹھہراؤ اور جامعیت تو پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اسے فنا نہیں کیا جاسکتا۔ باوجود قہر وغلبہ، تعلیم وتربیت کے اس کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میرے دست و بازو کی پیدا کی ہوئی اشیاء و خدمات پر اسٹیٹ کا قبضہ کیوں ہے اور میری کمائی ہوئی دولت پر تصرف کا اختیار مجھے کیوں نہیں ہے۔ اگر مساوات کی خاطر حکومت محنت و استعداد کے بموجب صلہ دینے پر اتر آئے تو بہتر صلاحیتوں والے کا صلہ کم صلاحیتوں والے کے مقابلہ زیادہ ہوگا کیونکہ اس کا کنٹری بیوشن دوسرے کے مقابلے زیادہ ہوگا۔ اب اگر حکومت مساوات کے نام پر ضرورتوں کا تعین خود کرے اور سب کو اس کی طے کی ہوئی پیمائش کے بموجب، برابر سے ملے تو یقیناً

زیادہ پیداوار کی صلاحیتوں والے افراد کی حق تلفی ہوگی۔ وہ اس بات پر فطری طور پر متفکر ہوں گے کہ وہ زیادہ پانے کے حقدار ہیں لیکن ان کے اس حق سے جبراً محروم رکھا جارہا ہے۔ یہ مصنوعی اور جبری مساوات معاشرہ کو منتشر ہونے سے نہیں بچا سکتا۔ اور تاریخ نے یہ ثابت کر دیا۔

دنیا کے ان دو بڑے نظاموں نے انسان کو ایک طرز زندگی تو ضرور آشنا کیا لیکن اس کو بلند نقطۂ انسانیت پر پہنچانے میں ناکامیاب رہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیاوی نظام حیات محض مادی عناصر کے تانے بانے سے حیات انسانی کو سجانے اور سنوارنے پر مرکوز رہے۔ مادی عناصر سے ہٹ کر، انسان کے کردار، اخلاق، نیک و بد اعمال، قناعت، صبر، حق گوئی جیسے غیر مادی عوامل کو، جو روح کی توانائی کا مظہر ہیں، نہ کوئی اہمیت دی گئی اور نہ ان کو جزو نظام بنا کر کامیابیوں و ناکامیابیوں کے پرکھنے کی کسوٹی تسلیم کیا گیا۔ یوں تو عدل و انصاف، مساوات، فلاح و بہبود، امداد، رعایت کے بہت سے نظریات ان نظاموں میں مل جائیں گے لیکن وہ آفاقی نظریات سے زیادہ محض ایک مخصوص زاویہ فکر کی تبلیغ کے آلہ کار کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ انسان باوجود مادی ترقی و آسودگیوں کے عروج کے، ذہنی انتشار، فکری کشمکش اور بدامنی کا شکار ہے اور ایک آدرش، صالح اور عدل و انصاف پر مبنی طرز معاشرت کی تلاش میں سرگرداں بھی دکھائی دیتا ہے۔ دنیاوی نظاموں کے فکر و عمل نے واضح کر دیا کہ وہ انسان کے فطری جذبات یعنی خواہشات، تمنائیں، خودغرضیاں اور آزادی کو کوئی بلندی نہ دے سکے۔ اگر وہ ان فطری جذبات کو اپنے نظریوں کی تبلیغ کا آلہ کار بننے کے بجائے، انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اترنے کا ذریعہ بناتے تو بہت ممکن تھا انسانیت کو بلندی مل جاتی اور ایک مستحکم شعور حیات کی تشکیل ہو جاتی۔

نہج البلاغہ میں انسانی فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر انسان کی کمزوریوں کا محاسبہ کیا گیا ہے اور حیات انسانی کی وسیع، عمیق اور جامع تصویر پیش کی گئی ہے۔ انسان اگر ہوس و خواہشات کا پتلا ہے تو صاحب عقل و فہم بھی ہے۔ اس لیے جذبات و خیالات کو اگر عقل و فہم کی کسوٹی پر پرکھنے کی طرف موڑ دیا جائے تو یہی مستحکم دستور حیات مرتب کرنے کی بنیاد ہوگی۔ نہج البلاغہ کے خطبات، تحریرات، اقوال و خطوط اور ان کی وسعتوں کا مطالعہ کیجیے تو دنیا کے مائل بہ فنا عناصر، ان کی کشش، دنیا کی بے ثباتی و بے مائیگی، بے رخی، بے رحمی کی جیتی جاگتی تصویریں اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ابھر کر سامنے آجائیں گی۔ ان کے لئے انسان کو مختلف نوعیتوں سے، کبھی تنبیہ کے لہجے میں، کبھی نصیحت سے، کبھی

ماضی کی تاریخ دہرا کر، کبھی نفسیاتی حربوں سے، کبھی فکر وعمل کی تعلیم کے ذریعہ آگاہ کیا جارہا ہے کہ اس فانی دنیا میں جو قلیل مدت کی زندگی لے کر آیا ہے اس کو تمام حشر سامانیوں سے محفوظ رہتے ہوئے کس طرح باوقار پرامن بنایا جاسکتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، جس کو اسلام نے تسلیم کیا ہے اور نہج البلاغہ نے متعدد مقامات پر واضح کیا ہے کہ انسان ہوس کا بندہ اور خواہشات کا پتلا ہے، وہ مفاد پرست اور خودغرض بھی ہے، اس کے پیش نظر غیر دائمی مادی لذت و راحت ہے، وہ ذاتی مصلحت کو معیار بناتا ہے اور اسی کے تحت جدوجہد کرتا ہے۔ یہ وہ فطری جذبات ہیں جن کو نہ آزاد چھوڑا جاسکتا ہے، نہ روکا جاسکتا ہے اور نہ محصور کیا جاسکتا ہے۔ ہر صورت میں معاشرے کا انتشار لازمی ہے اسلام جو دینِ فطرت و دین کامل ہے وہ نہ جبرو طاقت سے ان جذبات کو کچلتا ہے اور نہ ان کو آزاد چھوڑنے کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ ان کو روحانی افکار و اخلاق و اقدار کی مکمل سرکردگی و سرپرستی میں رکھنے کی تاکید کرتا ہے تاکہ ان کی بے راہ روی اور بے لگامی کو روکا جاسکے۔ اور متوازن نظام حیات کی تشکیل کی جاسکے۔

حضرت علیؑ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا ''اے لوگو! مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے۔ ایک خواہشوں کی پیروی اور دوسرے امیدوں کا پھیلاؤ۔ خواہشوں کی پیروی وہ چیز ہے جو حق سے روک دیتی ہے اور امیدوں کا پھیلاؤ آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے اس سے اتنا زادِ راہ لے لو جس سے کل اپنے نفسوں کو بچا سکو''۔

پھر دوسرے خطبہ میں فرمایا:

''تم امیدوں کے دور میں ہو جس کے پیچھے موت کا ہنگامہ ہے۔ تو جو شخص موت سے پہلے ان امیدوں کے دنوں میں عمل کرلیتا ہے تو یہ عمل اس کے لئے سودمند ثابت ہوتا ہے اور موت اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور جو شخص موت سے قبل زمانہ امید و آرزو میں کوتاہیاں کرتا ہے تو وہ عمل کے اعتبار سے نقصان رسیدہ رہتا ہے اور موت اس کے لئے پیغام ضرر لے کے آتی ہے۔ لہٰذا جس طرح اس وقت جب ناگوار حالات کا اندیشہ ہو نیک اعمال میں منہمک ہوتے ہو، ویسا ہی اس وقت بھی نیک اعمال کرو جب کہ مستقبل کے آثار مسرت افزا محسوس ہو رہے ہوں''۔

پھر دنیا کو یوں متعارف کرایا:

''میں تمہیں دنیا سے ڈراتا ہوں اس لیے کہ یہ بظاہر شیریں و خوشگوار، تر و تازہ و شاداب ہے۔

نفسانی خواہشات اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ جلد میسر آجانے والی نعمتوں کی وجہ سے لوگوں کو محبوب ہوتی ہے اور اپنی تھوڑی سی آرائشوں کا مشتاق بنالیتی ہے۔ وہ جھوٹی امیدوں سے سجی ہوئی ہے اور دھوکے اور فریب سے بنی سنوری ہے نہ اس کی مسرتیں دیرپا ہیں اور نہ اس کی ناگہانی مصیبتوں سے مطمئن رہا جاسکتا ہے۔ وہ دھوکے باز، نقصان رساں، ادلنے، بدلنے والی اور فنا ہونے والی ہے، ختم ہونے والی ہے، مٹ جانے والی ہے کھا جانے والی اور ہلاک کر دینے والی ہے۔

جو شخص اس دنیا کا عیش و آرام پاتا ہے اس کے بعد اس کے آنسو بھی بہتے ہیں اور جو شخص دنیا کی مسرتوں کا رخ دیکھتا ہے، وہ مصیبتوں میں ڈھکیل کر اس کو اپنی بے رخی بھی دکھاتی ہے اور جس شخص پر راحت و آرام کے ہلکے ہلکے چھینٹے ڈالتی ہے، اس پر مصیبت و بلا کی دھواں دھار بارش بھی کرتی ہے وہ خود بھی فنا ہو جانے والی ہے اور اس میں رہنے والا بھی فانی ہے۔ اس کے کسی زاد میں سوائے تقویٰ کے بھلائی نہیں۔ جو شخص کم حصہ لیتا ہے، راحت کے سامان بڑھالیتا ہے اور جو دنیا کو زیادہ سمیٹتا ہے وہ اپنے لیے تباہ کن چیزوں کا اضافہ کر لیتا ہے۔

کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے دنیا پر بھروسہ کیا اور اس نے انہیں مصیبتوں میں ڈال دیا اور کتنے ہی اس پر اطمینان کیے بیٹھے تھے۔ جنہیں اس نے پچھاڑ دیا اور کتنے ہی رعب و طنطنہ والے تھے جنہیں فقیر و پست بنادیا اور کتنے ہی نخوت و غرور والے تھے جنہیں ذلیل کر کے چھوڑا۔ اس کی بادشاہی دست بدست منتقل ہونے والی ہے۔ اس کی سلطنت چھن جانے والی۔ اس کا زبردست زبردست بننے والا، مال دار بدبختیوں کا ستایا ہوا ہے۔

کیا تم انہیں سابقہ لوگوں کے گھروں میں نہیں بستے جو لمبی عمروں والے، پائیدار نشانیوں والے، بڑی بڑی امیدیں باندھنے والے، زیادہ گنتی شمار والے اور بڑے بڑے لاؤ لشکر والے تھے، وہ دنیا کی کس کس طرح پرستش کرتے رہے اور اسے آخرت پر کیسا کیسا ترجیح دیتے رہے۔ پھر بغیر کسی ایسی زاد و راحلہ کے جو انہیں راستہ طے کر کے منزل تک پہنچاتے، چل دیئے۔ کیا تمہیں کبھی یہ خبر پہنچی کہ دنیا نے ان کے بدلے میں کسی فدیہ کی پیشکش کی ہو یا انہیں کوئی مدد پہنچائی ہو یا اچھی طرح ان کے ساتھ رہی ہو۔ اُس نے تو بالآخر انہیں ناک کے بل خاک پر پچھاڑ دیا۔ تم نے دیکھا کہ جو ذرا دنیا کی طرف جھکا اور اُسے اختیار کیا اور اُس سے لپٹا تو اس نے اپنے تیور بدل کر ان سے کیسی اجنبیت اختیار کرلی اور یہاں تک کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو کر چل دیئے۔ اور اس نے انہیں

بھوک کے سوا کچھ زادِراہ نہ دیا اور ایک تنگ جگہ کے سوا کوئی ٹھہرنے کا سامان نہ کیا اور سوائے گھپ اندھیرے کے کوئی روشنی نہ دی اور نہ ندامت کے سوا کوئی نتیجہ دیا۔

تو کیا تم اسی دنیا کو ترجیح دیتے ہو یا اسی پر مطمئن ہوگئے ہو اُن لوگوں سے عبرت حاصل کرو جو کہا کرتے تھے کہ "ہم سے زیادہ قوت و طاقت میں کون ہے"۔ اُنھیں لاد کر قبروں تک پہنچایا گیا، اس طرح نہیں کہ انہیں سوار سمجھا جائے اُنھیں قبروں میں اتار دیا گیا مگر وہ مہمان نہیں کہلائے پتھروں سے ان کی قبریں چن دی گئیں اور خاک کا کفن ان پر ڈال دیا گیا اور گلی سڑی ہڈیوں کو ان کا ہمسایہ بنادیا گیا۔ وہ ایسے ہمسائے ہیں کہ پکارنے والے کو جواب نہیں دیتے اور اور نہ زیادتیوں کو روک سکتے ہیں...... وہ ایک جگہ ہیں مگر الگ الگ وہ آپس میں ہمسایہ ہیں مگر دور دور۔ پاس پاس ہیں مگر میل و ملاقات نہیں۔ وہ بردبار بنے خاموش و بےخبر پڑے ہیں۔ ان کے بغض و عناد ختم ہوگئے اور کینے مٹ گئے نہ ان سے کسی ضرر کا اندیشہ ہے، نہ کسی تکلیف کے دور کرنے کی توقع ہے۔ جس طرح ننگے پیر و ننگے بدن پیدا ہوئے تھے ویسے ہی زمین میں پیوندِ خاک ہوگئے اور اس دنیا سے صرف عمل لے کر ہمیشہ کی زندگی اور سدا رہنے والے گھر کی طرف کوچ کر گئے"۔

انسان کو دنیا کی حقیقت کا آئینہ اس لیے دکھلایا جارہا ہے کہ وہ صاحب عقل و فہم ہے اور وہ غور و فکر کے ذریعہ محتاط و متوازن رُخ اختیار کرسکتا ہے۔ انسانی معاشرہ ذہنی سوجھ بوجھ جذبات، احساسات، طبیعت و تبیت، جسمانی طاقت اور رُجحانات کے اعتبار سے مختلف درجات میں بٹے ہونے کے باوجود خواہشات، امیدوں، تمناؤں اور خود غرضیوں کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ اسی لیے ان میں بکھراؤ، ٹکراؤ اور تضاد پایا جاتا ہے جس کا پورا فائدہ دنیاوی نظاموں نے اٹھایا اور انسان کو صرف اس کے ظاہری مادی عناصر کا اسیر بنالیا۔ نہج البلاغہ میں ان ظاہری عناصر کی گرویدگی کی تباہ کاریوں سے متنبہ کیا جارہا ہے اور ان کو باطنی قوتوں کے زیرِ نگر رکھنے کی تعلیم دی جارہی ہے تاکہ ان کی سرکشی معاشرہ کی تباہی کا سبب نہ بننے پائے۔

نہج البلاغہ میں آفاقی نظامِ حیات کے لئے اس بکھراؤ، ٹکراؤ اور تضاد کو سب سے پہلے ختم کیا گیا ہے۔ یہاں عالمِ انسانیت کو ایک لڑی میں پروتے ہوئے ایسے بلند ترین نقطہ کی طرف سمیٹنے کی کوشش کی جارہی جس کے پرے انسانی عقل و فہم بے معنی ہوجاتی ہے۔ یہ بلند ترین نقطہ "توحید" ہے جو عالم بشریت کی بکھری و متضاد فکر کو متحدہ کرنے کا واحد و موثر ذریعہ ہے۔

اگر ہر انسان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوجائے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے، سب اس ایک خالق کے بندے ہیں، ہماری زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ ہمارے ہر ارادے، ہر نیت اور ہر عمل سے آگاہ ہے اور اس کے بموجب ہم کو سزا و جزا دیتا ہے تو انسانوں کے درمیان ہر طرح کی تفریق کا جذبہ مٹ جائے گا اور یہی پُر احتیاط ذہنی ہم آہنگی ہمارے عدل وانصاف و مساوات کی بنیاد بنے گا۔ دوسری طرف اگر دنیا کی بے ثباتی، بے رخی بے رحمی کا یقین ہوجائے تو اس کو انسان ایک ''امتحان گاہ'' اور ''گزرگاہ'' سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا اور چونکہ ''امتحان گاہ'' اور گزرگاہ'' سمجھنے کا یقین اعتراف ہے کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے اور اس کو اس کے بعد ایک دائمی زندگی کی طرف جانا ہے جہاں فانی دنیا کے فانی عناصر ساتھ نہیں دے سکتے، ہاں جو یہاں سے زاد راہ وہاں کے لئے ہے وہ بس اس کے اعمال صالح ہی ہیں، تو بس یہ یقین کامل دنیا کے عیش وطرب سے منھ موڑنے، اس کو حد سے تجاوز نہ کرنے اور ان کو غلام نہ بننے کی ترغیب ہوگی۔ یہاں دولت و ثروت سمیٹنے سے زیادہ تقسیم کرنے کا رُجحان تقویت پائے گا جو فلاح عام کا ذریعہ بنے گا۔ یہی قناعت، توکل اور ''تطہیر نفس'' بے لگام خواہشات، تمناؤں امیدوں اور خودغرضیوں کو راہِ راست پر قائم رکھنے کا ذریعہ بنیں گے۔

حضرت علیؑ نے اپنے مختلف خطبات، نصیحتوں، خطوط و تحریرات میں اس بات پر مختلف نوعیتوں سے زور دیا کہ انسان کی بلندی، وقار اور شرف خواہشات کے ساتھ بہہ جانے میں نہیں بلکہ اعلیٰ قدروں کے لئے سعی و کوشش اور بلند مقصد کے لئے جدوجہد میں مضمر ہے یہی تطہیر نفس اختیارات پر قابو پانا سکھاتی ہے اور یہی اختیارات پر قابو پالینا اصل آزادی ہے۔ یہ وہ راہ ہے جہاں انسان تہذیب و معاشرت کا آغاز بندگی، ایمان و یقین سے ہوتا ہے اور نتیجہ میں انسان جملہ پابندیوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔ نہج البلاغہ میں ایک مقام پر فرمایا ''اسلام سر تسلیم خم کرنا ہے اور سر تسلیم جھکانا یقین ہے اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق اعتراف فرض کی بجا آوری ہے اور فرض کی بجا آوری عمل ہے''۔ پھر فرمایا ''جو عمل میں کوتاہی کرتا ہے وہ رنج و اندوہ میں مبتلا ہے اور جس کے مال میں اللہ کا کچھ حصہ نہ ہو اللہ کو ایسے کی کوئی ضرورت نہیں''۔

یہ یقین کہ دنیاوی زندگی بہت تھوڑی ہے اور یہاں سے جو بھی سمیٹا گیا وہ ساتھ نہیں جائے گا، خالی ہاتھ آیا ہے تو خالی ہی ہاتھ جائے گا، یقیناً دولتمند کے دولت سمیٹنے کی ہوس پر مضبوط روک ہے۔

پھر یہ یقین کہ خلقت و انجام کے اعتبار سے ہر انسان ایک ہے خواہ وہ شاہ ہو یا گدا، یہ اگر دولت و ثروت مند کے لئے تنبیہ ہے تو غربت کے لئے تسلی بھی ہے۔ انسان کو آگاہ کیا گیا کہ مال یقیناً تمہارا ہے لیکن تم اللہ کے بندے ہو اس لیے اپنے مال کو اس وقت تک اپنا نہ سمجھو جب تک تمہاری طرح تمام بنی نوع انسان خواہ وہ کتنے ہی غریب و نادار کیوں نہ ہوں ایک بھی نادار بھوکا باقی ہے۔ اور یہ اسی وقت ہوگا جب تم اپنے مال میں خدا کا حق سمجھو گے اور اس کو ناداروں میں تقسیم کردو گے۔ یقیناً انسانی محنت وجستجو وکاوش کسی شے کو انسانی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بناتی ہے اور یہی محنت وکاوش اس کے ذہن میں ملکیت کا تصور پیدا کرکے اس شے پر قابض ہوجانے کا جذبہ ابھارتی ہے یہی رعونت ہے۔ لیکن عقل وفہم یہ بتلاتی ہے کہ یہ قبضہ ناجائز ہے۔ ذاتی ملکیت کو عمل ومحنت کے دائرے تک محدود رہنا چاہئے۔ جہاں انسانی محنت کی رسائی نہیں وہاں ذاتی ملکیت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ زمین و اس کی قوت نمو زرخیزی، زمین میں دفن معدنیاتی خزانے، گیس پیٹرول، جنگلات اور ان کی دولت، پانی، سورج کی حرارت، سمندر اور سمندر کی دولتیں پیدا کرنے میں انسانی عمل کا، اس کی کاوشوں کا کوئی دخل نہیں۔ اس کا عمل تو تلاش وجستجو تک محدود ہے۔ اگر انسان یہ دعویٰ کرے کہ یہ تمام اشیاء معدوم تھیں، ہم نے ان کو تلاش کیا، عدم سے وجود میں اس طرح لائے کہ وہ ہماری ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ بنیں تو اس طرح کسی شئے کی قیمت اور افادیت کا ایجاد کردہ انسان ہوا اور وہی اس کا مالک ہوا۔

اس مقام پر انسانی عقل کو جھنجھوڑا گیا۔ پوچھا گیا بتاؤ اس دماغ وذہن کا موجب کون ہے جس کی بدولت تمہاری تمام تر تحقیقات وتربیت عمل میں آتی ہیں اور جس کے ذریعہ سے قدرت کی پوشیدہ نعمتوں کا اظہار کرتے رہنے کے قابل بنتے ہو۔ کسی شئے کا وسیلہ بننا خالق بننا نہیں ہوتا۔ تمہاری محنت اور عمل تو خلق کی ہوئی شے پر محنت کرتی ہے۔

خالق کی خلق کی ہوئی شے سے اگر تم محض اپنی محنت وکاوش کی بدولت استفادہ کرتے ہو اور پھر حق ملکیت جتاتے ہو تو خالقِ حقیقی کے حق کو کیوں بھول جاتے ہو اور اگر مال میں اللہ کا کچھ حصہ نہیں سمجھتے ہو تو پھر اللہ کو بھی ایسے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان چاہے جتنا صاحب دولت وثروت والا ہوجائے، چاہے جتنی طاقت وقوت سمیٹ لے، چاہے جتنا صاحب اقتدار بن جائے وہ اپنی ہر خواہش، ہر آرزو اور ہر تمنا پوری کرنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اگر انسان صاحب عقل وفہم ہے تو اس

حقیقت کو تسلیم کرلے گا۔ کسی شخص نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ نے خدا کو کیسے پہچانا تو فرمایا ''میں نے خدا کو پہچانا ارادوں کے ٹوٹ جانے سے، نیتوں کے بدل جانے سے اور ہمتوں کے پست ہوجانے سے'' پھر فرمایا ''اللہ کی عظمت کا احساس کرو تاکہ تمہاری نظروں میں کائنات حقیر و پست ہوجائے''۔ جو لوگ دنیا کی بے ثباتی، بے رخی اور اپنے آخیر انجام سے بے خبر ہیں اور مادی عیش و طرب کے حصول کو ہی مقصد حیات سمجھ بیٹھے ہیں وہ ''ایسے سواروں کے مانند ہیں جو سو رہے ہیں اور سفر جاری ہے''۔

حضرت علیؑ نے اپنے فرزند امام حسنؑ کو وصیت کرتے ہوئے جس طرح کی تعلیم دی وہ دستورِ حیات اور اقدارِ بشریت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ میں اس طویل وصیت کے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

''میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہنا، اس کے احکام کی پابندی کرنا، اس کے ذکر سے قلب کو آباد رکھنا اور اسی کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا...... وعظ و پند سے دل کو زندہ رکھنا اور زُہد سے اُس کی خواہشوں کو مردہ۔ یقین سے اسے سہارا دینا اور حکمت سے اسے پُرنور بنانا۔ موت کی یاد سے اسے قابو میں کرنا۔ فنا کے اقرار پر اسے ٹھہرانا۔ دنیا کے حادثے اس کے سامنے لانا۔ گردشِ روزگار سے اسے ڈرانا، گزرے ہوؤں کے واقعات اس کے سامنے رکھنا۔ تمہارے پہلے والے لوگوں پر جو بیتی ہے اسے یاد دلانا، ان کے گھروں اور کھنڈروں میں چلنا پھرنا اور دیکھنا انہوں نے کیا کچھ کیا، کہاں سے کوچ کیا، کہاں اترے اور کہاں ٹھہرے ہیں۔ دیکھو گے تو صاف نظر آئے گا کہ وہ دوستوں سے منہ موڑ کر چلدیئے ہیں اور پردیس کے گھروں میں جا کر اترے ہیں اور وہ وقت دور نہیں کہ تمہارا شمار بھی ان میں ہونے لگے، لہٰذا اپنی اصل منزل کا انتظار کرو۔

اے فرزند! یہ یقین رکھو کہ جس کے ہاتھ میں موت ہے اسی کے ہاتھ میں زندگی بھی ہے اور جو پیدا کرنے والا ہے وہی مارنے والا بھی ہے اور جو نیست و نابود کرنے والا ہے وہی دوبارہ پلٹانے والا ہے جب تم پیدا ہوئے تو کچھ نہ جانتے تھے، بعد میں تمہیں سکھایا گیا اور ابھی کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں کہ جن سے تم بے خبر ہو۔ ان کے لئے پہلے تمہارا ذہن پریشان ہوتا ہے اور نظر بھٹکتی ہے اور پھر انہیں جان لیتے ہو لہٰذا اسی کا دامن تھامو جس نے تمہیں پیدا کیا اور رزق دیا اسی کی طلب ہو، اسی کا ڈر ہو۔

اے فرزند! میں نے تمہیں دنیا اور اس کی حالت اور اس کی بے ثباتی و ناپائیداری سے خبردار کردیا

ہے اور آخرت والوں کے لئے جو سروسامانِ عشرت مہیا ہے اس سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔

اب دستورِ حیات و معاشرتی اصولوں کی تلقین اس طرح کر رہے ہیں:

''اے فرزند! اپنے اور دوسرے کے درمیان ہر معاملہ میں اپنی ذات کو میزان قرار دو، جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لئے پسند کرو اور جو اپنے لیے نہیں چاہتے اسے دوسروں کے لئے بھی نہ چاہو۔ جس طرح یہ چاہتے ہوں کہ تم پر زیادتی نہ ہو، یوں ہی دوسروں پر بھی زیادتی نہ کرو، اور جس طرح یہ چاہتے کہ تمہارے ساتھ حسن سلوک ہو یوں ہی دوسروں کے ساتھ بھی حُسن سلوک سے پیش آؤ...... دوسروں کے لیے وہ بات نہ کہو جو اپنے لیے سننا گوارا نہیں کرتے۔ یاد رکھو کہ خود پسندی صحیح طریقہ کار کے خلاف اور عقل کی تباہی کا سبب ہے۔ روزی کمانے میں دوڑ دھوپ کرو اور دوسرے کے خزانچی نہ بنو...... دیکھو تمہارے سامنے ایک دشوار گذار اور دور دراز راستہ ہے جس کے لئے بہترین زادِراہ کی تلاش اور بقدرِ کفایت توشہ فراہمی اس کے علاوہ سبکباری ضروری ہے۔ لہٰذا اپنی طاقت سے زیادہ اپنی پیٹھ پر بوجھ نہ لادو...... تمہارے سامنے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جس میں ہلکا پھلکا آدمی گراں بار آدمی سے کہیں اچھی حالت میں ہوگا اور سست رفتار تیز قدم دوڑنے والے کی بہ نسبت بُری حالت میں ہوگا۔

یہ یقین کے ساتھ جانے رہو کہ تم اپنی آرزوؤں کو کبھی پورا نہیں کرسکتے اور جتنی زندگی لے کے آئے ہو اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور تم بھی اپنے پہلے والوں کی راہ پر ہو لہٰذا طلب میں نرم رفتاری اور کسب معاش میں میانہ روی سے کام لو کیونکہ اکثر طلب کا نتیجہ مال کا گنوانا ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ رزق کی تلاش میں لگا رہنے والا کامیاب ہی ہو، اور کدوکاوش میں اعتدال سے کام لینے والا محروم ہی رہے۔ ہر ذلت سے اپنے نفس کو بلند سمجھو، اگرچہ کہ وہ تمہاری من مانی چیزوں تک تمہیں پہنچادے کیونکہ اپنے نفس کی عزت جو کھودو گے اس کا بدل کوئی حاصل نہ کرسکو گے۔ دوسرے کے غلام نہ بن جاؤ جب کہ اللہ نے تم کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس بھلائی میں کوئی بہتری نہیں جو برائی کے ذریعہ حاصل ہو اور اس آرام و آسائش میں کوئی بہتری نہیں جس کے لئے ذلت بھری دشواریاں جھیلنا پڑیں۔

خبردار تمہیں طمع و حرص کی تیز رو سواریاں ہلاکت کے گھاٹ پر نہ لا اتاریں...... جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اس کو محفوظ رکھنا دوسروں کے سامنے دستِ طلب بڑھانے سے مجھے زیادہ پسند ہے۔ اس کی تلخی سہہ لینا لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے۔ پاکدامانی کے ساتھ محنت مزدوری کر لینا

فسق و فجور میں گھری ہوئی دولت مندی سے بہتر ہے۔

جو زیادہ بولتا ہے وہ بے معنی باتیں کرنے لگتا ہے۔ سوچ وچار سے قدم اٹھانے والا صحیح راستہ دیکھ لیتا ہے۔ نیکوں سے میل جول رکھو گے تو تم بھی نیک ہو جاؤ گے۔ بروں سے بچے رہو گے تو ان کے اثرات سے محفوظ رہو گے۔ جہاں نرمی سے کام لینا نامناسب ہو وہاں سخت گیری ہی نرمی ہے۔ کبھی کبھی دوا بیماری اور بیماری دوا بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی بدخواہ بھلائی کی راہ سجھا دیا کرتا ہے اور دوست فریب دے جاتا ہے۔ خبردار امیدوں کے سہارے پر نہ بیٹھنا کیونکہ امیدیں احمقوں کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ تجربوں کو محفوظ رکھنا عقلمندی ہے۔ بہترین تجربہ وہ ہے جو نصیحت دے۔ فرصت کا لمحہ موقع غنیمت جانو قبل اس کے کہ وہ رنج و اندوہ کا سبب بنے۔

جب تک زمانہ کی سواری تمہارے قابو میں ہے، نباہ کرتے رہو، زیادہ کی امید میں اپنے کو خطروں میں نہ ڈالو، خبردار کہیں دشمنی و عناد کی سواریاں تم سے منہ زوری نہ کرنے لگیں۔

اپنے کو اپنے بھائی کے لئے اس پر آمادہ کرو کہ جب وہ دوستی توڑے تو تم اسے جوڑو، وہ منھ پھیرے تو تم آگے بڑھو اور لطف و مہربانی سے پیش آؤ۔ وہ تمہارے لیے کنجوسی کرے تو تم اس پر خرچ کرو۔ وہ دوری اختیار کرے تو تم اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کرو۔ وہ سختی کرتا رہے اور تم نرمی کرو۔ وہ خطا کا مرتکب ہو اور تم اس کے لئے عذر تلاش کرو..... مگر خبردار، یہ برتاؤ بے محل نہ ہو اور نا اہل سے یہ رویہ اختیار نہ کرو۔ اپنے کسی دوست سے تعلقات قطع کرنا چاہو تو اپنے دل میں اتنی گنجائش رکھو کہ اگر اس کا رویہ بدلے تو اس کے لئے جگہ ہو۔

اے فرزند! یقین رکھو کہ رزق دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جس کی تم جستجو کرتے ہو اور ایک وہ جو تمہاری جستجو میں ہے۔ اگر تم اس کی طرف نہ جاؤ گے تو وہ تم تک آ کے رہے گا۔ ضرورت پڑنے پر گڑگڑانا اور مطلب نکل جانے پر کج خلقی سے پیش آنا انتہائی بری عادت ہے۔ دنیا سے بس اتنا ہی اپنا سمجھو جس سے اپنی عقبیٰ کی منزل سنوار سکو۔ ٹوٹ پڑنے والے غم اور اندوہ کو صبر کی پختگی اور حسن یقین سے دور کرو، جو درمیانی راستہ چھوڑ دیتا ہے وہ بے راہ ہو جاتا ہے۔ جو اپنی حیثیت سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی منزلت برقرار رہتی ہے"۔

یہ منشور امامت تمام نوع انسانی کے لیے درس ہدایت ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے کامیابی و کامرانی کی راہیں کھلتی ہیں۔ اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ مستقیم ملتی ہے۔ اس خطبہ میں دنیا کی حقیقت کو

واضح کرنے، اخلاقی شعور کو اُبھارنے اور معیشت و معاشرت کو سُدھارنے کے بنیادی اصول درج ہیں۔ ایک انسان کے غرور و تکبر کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے جب:

"اگر اُسے اُمید کی جھلک نظر آتی ہے تو طمع ذلت میں مبتلا کردیتی ہے اور طمع ابھرتی ہے تو حریص کو تباہ و برباد کردیتی ہے۔ اگر ناامیدی اُس پر چھا جاتی ہے تو حسرت و اندوہ اس کے لئے جان لیوہ بن جاتے ہیں اور اگر اس پر غضب طاری ہوتا ہے تو غم و غصہ شدت اختیار کرلیتا ہے اور اگر خوش و خوشنود نظر آتا ہے تو حفظِ ماتقدم بھول جاتا ہے اور اگر اچانک اُس پر خوف طاری ہوتا ہے تو فکر و اندیشہ دوسری قسم کے تصورات سے روک دیتا ہے۔ اگر امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے تو غفلت اس پر قبضہ کرلیتی ہے اور اگر مال و دولت حاصل کرلیتا ہے تو دولتمندی اسے سرکش بنادیتی ہے اور اگر اس پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو بے تابی و بے قراری اسے رسوا کردیتی ہے اور اگر فقر و فاقہ کی تکلیف میں مبتلا ہو تو مصیبت اسے جکڑ لیتی ہے اور اگر بھوک اس پر غلبہ کرتی ہے تو ناتوانی اٹھنے نہیں دیتی اور اگر شکم پُری بڑھ جاتی ہے تو کرب و اذیت کا باعث ہوتی ہے۔ ہر کوتاہی اس کے لئے نقصان رساں اور حد سے زیادتی تباہ کن ہوتی ہے"۔ ۱

اور پھر فرمایا:

عقل سے بڑھ کر کوئی مال سود مند نہیں اور خود بینی سے بڑھ کا کوئی تنہائی وحشتناک نہیں اور تدبیر سے بڑھ کر کوئی عقل کی بات نہیں اور کوئی بزرگی تقویٰ کے مثل نہیں اور خوش خلقی سے بڑھ کر کوئی ساتھی نہیں اور ادب کے مانند کوئی میراث نہیں۔ توفیق سے بڑھ کر کوئی پیشرو اور اعمالِ خیر سے بڑھ کر کوئی تجارت نہیں۔ کوئی پرہیزگاری شبہات میں توقف سے بڑھ کر نہیں اور حرام کی طرف بے رغبتی سے بڑھ کر کوئی زہد نہیں اور تفکر و پیش بینی سے بڑھ کر کوئی علم نہیں اور ادائے فرائض کے مانند کوئی عبادت اور حیا سے بڑھ کر کوئی ایمان نہیں...... علم سے بڑھ کر کوئی عزت اور مشورہ سے مضبوط کوئی پشت پناہ نہیں"۔ ۲

حضرت علیؑ کمیل ابنِ زیاد نخعی کو یہ کہہ کر تعلیم دیتے ہیں۔

اے کمیل یاد رکھو! علم مال سے بہتر ہے کیونکہ علم تمہاری نگہداشت کرتا ہے جب کہ مال کی حفاظت تمہیں کرنی پڑتی ہے۔ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے جب کہ علم صرف کرنے سے بڑھتا ہے۔

---

۱۔ حکم و مواعظ نمبر ۱۰۸ صفحہ ۸۳۶ ۲۔ حکم و مواعظ نمبر ۱۱۳ صفحہ ۸۳۸

مال و دولت کے نتائج و اثرات مال کے فنا ہو جانے سے فنا ہو جاتے ہیں علم کی شناسائی ایک دین ہے کہ اس سے انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے اپنی اطاعت منواتا ہے اور مرنے کے بعد نیک نامی حاصل کرتا ہے۔ یاد رکھو علم حاکم ہے اور مال محکوم۔ اے کمیل! مال اکٹھا کرنے والے زندہ ہونے کے باوجود مردہ ہوتے ہیں اور علم حاصل کرنے والے رہتی دنیا تک باقی رہتے ہیں۔ بے شک ان کے اجسام نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں مگر ان کی صورتیں دلوں میں موجود رہتی ہیں"۔

حضرت علیؑ نے اپنے فرزند حضرت حسنؑ سے فرمایا:

"چار باتیں یاد رکھو۔ اُن کے ہوتے ہوئے جو کچھ کرو گے وہ تمہیں ضرر نہ پہنچائے گا سب سے بڑی ثروت عقل و دانش ہے اور سب بڑی ناداری حماقت و بے عقلی ہے اور سب بڑی وحشت غرور و خود بینی ہے اور سب بڑا جوہر ذاتی حسن اخلاق ہے"۔

"اے فرزند! بیوقوف سے دوستی نہ کرنا کیونکہ وہ تمہیں فائدہ پہنچانا بھی چاہے تو نقصان پہنچائے گا۔ اور بخیل سے دوستی نہ کرنا کیونکہ جب تمہیں اس کی مدد کی انتہائی حاجت ہوگی تو وہ تم سے دور بھاگے گا اور بدکردار سے دوستی نہ کرنا ورنہ وہ تمہیں کوڑیوں کے مول بیچ ڈالے گا اور جھوٹے سے دوستی نہ کرنا کیونکہ وہ سراب کی مانند تمہارے لیے دور کی چیزوں کو قریب اور قریب کی چیزوں کو دور کر کے دکھلائے گا"۔

معاشرہ میں انسانوں کے ساتھ حُسن سلوک کے بارے میں یوں فرمایا:

"لوگوں سے اس طریقے سے ملو کہ اگر مر جاؤ تو تم پر روئیں اور زندہ رہو تو تمہارے مشتاق رہیں"۔

پھر ایک مقام پر فرمایا: "جو شخص اپنے قبیلے کی اعانت سے ہاتھ روک لیتا ہے تو اس کا تو ایک ہاتھ رکتا ہے لیکن وقت پڑنے پر بہت سے ہاتھ اس کی مدد سے رک جاتے ہیں"۔

محمد ابن ابی بکر کو جب مصر کی حکومت سپرد کی تو ان کو ہدایت دی:

"لوگوں سے تواضع کے ساتھ ملنا، ان سے نرمی کا برتاؤ کرنا، کشادہ روئی سے پیش آنا اور سب کو ایک نظر سے دیکھنا تاکہ بڑے لوگ تم سے اپنی ناحق طرفداری کی امید نہ رکھیں اور چھوٹے لوگ تمہارے عدل و انصاف سے ناامید نہ ہوں۔ کیونکہ اے اللہ کے بندو! اللہ تمہارے چھوٹے، بڑے، کھلے، ڈھکے اعمال کی تم سے بازپُرس کرے گا اور اس کے بعد اگر وہ عذاب کرے تو خود یہ تمہارے ظلم کا نتیجہ ہے اور اگر وہ معاف کر دے تو وہ اس کے کرم کا تقاضہ ہے"۔

پھر ایک مقام پر فرمایا:

''انصاف سے دوستوں میں اضافہ ہوتا ہے، لطف و کرم سے قدرومنزلت بڑھتی ہے، جھک کے ملنے سے نعمت تمام ہوتی ہے، دوسروں کا بوجھ بٹانے سے لازماً سرداری حاصل ہوتی ہے اور خوش گفتاری سے کینہ دور اور دشمن مغلوب ہوتا ہے اور سر پھرے آدمی کے مقابلہ بردباری کرنے سے اس کے مقابلہ اپنے طرفدار زیادہ ہوجاتے ہیں''۔

پھر فرمایا: ''دوسروں کے پسماندگان سے بھلائی کرو تاکہ تمہارے پسماندگان پر بھی نظر شفقت پڑے''۔

نہج البلاغہ میں دستور حیات اور اقدار بشریت کو قانون قدرت سے بندھے آفاقی قوانین، ٹھوس و مدلل عقائد، فطرت و عقل و دانش کے دائرے میں رکھ کر واضح کیا گیا ہے۔ یہاں بنی نوع انسان کے لئے ایسا معتدل، متوازن اور دائمی نظام حیات پیش کیا گیا ہے جو انسان کی پر امن، پروقار و بلند معیار زندگی کا ضامن ہے۔ نہج البلاغہ میں حیات انسانی کے دو اہم پہلوؤں کو دستور حیات کی بنیاد بنایا گیا۔ اول واقعیت اور دوسرا اخلاقیت ہے۔ واقعیت سے مراد ایسے مقاصد حاصل کرنا جو فطرت و ضمیر کے عین مطابق ہو۔ یعنی جہاں زندگی نہ اتنی آزاد ہو کہ بے راہ روی کی ڈگر پر بے لگام بڑھے اور نہ احکاموں کی زنجیروں میں ایسی جکڑی بندھی ہو کہ گھٹن کا احساس ہو اور انسان اسکو اتار پھینکے۔ فطری خواہشات کو عقل کی پاسبانی میں دیا اور اخلاقی اصولوں میں محصور کیا۔ فطری خواہشات کو نہ دبایا اور نہ ان کی اہمیت کو نظر انداز کیا، بلکہ ان کے بھڑکنے اور وسیع ہونے کو دنیا کے مائل بہ فنا مادی وسائل، اس کی تمام تر سرکشی، بے ثباتی اور بے رخی کی حقیقی تصویر دکھلا کر عقل و دانش کے ذریعہ نتائج سے آگاہ کیا۔ دنیاوی نظام تو حیات انسانی کے مادی پیکر ہی میں الجھ کر رہ گئے اور اس کا بھی کوئی موثر و معتبر دستور نہ بنا سکے۔ نہج البلاغہ میں نہ صرف انسان کی مادی دنیا سنورتی نظر آتی ہے بلکہ اس کے وہ اخلاقی پہلو بھی ابھرتے ہیں جن کی بدولت وہ حیات جاودانی حاصل کرلیتا ہے۔ آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک اور بین الاقوامی ادارے جس طور سے اور جس سنجیدگی سے انسانی معاشرے کے اخلاقی پہلوؤں پر غور کر رہے ہیں، ان کی اہمیت کو تسلیم کر رہے ہیں وہ ان تمام عبرت ناک نتائج کا ردعمل ہے جو مادہ پرستی میں ڈوبنے کی بدولت سامنے آئے ہیں۔ جیسے جیسے دنیا مادہ پرستی کے فسوں سے باہر آئے گی، نہج البلاغہ کے ہی سایہ عافیت میں پناہ پائیگی۔

## حوالے:


۱- نہج البلاغہ: مترجم علامہ مفتی جعفر حسین صاحب، عباس بک ایجنسی، لکھنؤ ۲۰۰۰

2- NAHJUL BALAGHA - PEAK OF ELOQUENCE, TRANSLATED BY S.ALI RAZA, ISLAMIC FOUNDATION PRESS, AREEKODA, KERALA 1990

3- KITABAL-IRSHAD- SHAYKH -AL- MUFID, TRANSLATED BY I.K.A. HOWARD, UNIVERSITY OF EDINBURGH, ANSARIYAN PUBLICATION, QUM, IRAN

4- PHILOSOPHY OF ISLAM- BEH ECHTI & BAHONAR, ANSARIYAN PUBLICATION, IRAN 1990

۵- آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات۔ علامہ سید محمد باقر الصدر طاب ثراہ، مترجم علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

۶- خدا کے بجائے لا الٰہ (عرفان و عمل) شمر امام، کلاسیک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل دہلی ۲۰۰۳ء

۷- عقل و دل۔ شہید مرتضیٰ مطہری، توحید، جلد ۲ نومبر۔دسمبر ۱۹۹۳ء

۸- دانش مسلمین (قسط دو) محمد رضا حکیمی، توحید، جلد ۲ نومبر۔دسمبر ۱۹۹۳ء

9- ISLAMIC AWACKENING BETWEEN REJECTION AND EXTREMISM- DR. YOOSUF AL-QARADAWI, NEW DELHI -1992